زندگی حاصل کرنے کیلئے موت کا پیالہ پینا ضروی ہے

(فرمودہ ۲۵-اگست ۱۹۳۳ء بمقام پالم پور)

تشہّد ' تعوّذ اور سورۃ فاتحہ کی تلاوت کے بعد فرمایا:-

اللہ تعالیٰ قرآن مجید میں ایک قوم کے لوگوں کے متعلق فرماتا ہے کہ وہ اپنے گھروں سے موت کے خوف سے نکلے- انہوں نے چاہا کہ وہ زندگی حاصل کریں- ان کی اس خواہش کو پورا کرنے کیلئے اللہ تعالیٰ نے انہیں جو تدبیر بتائی وہ یہ تھی کہ تم اپنے لئے موت اختیار کرو- ایک ایسی قوم جو موت سے بچنے کیلئے گھر سے نکلی' اسے قدرتی طور پر یہ علاج عجیب نظر آیا- وہ لوگ حیران ہوئے اور ہونا چاہیئے تھا- جنہوں نے اپنا وطن خواہ وہ اختیار کردہ ہی ہو' املاک خواہ تھوڑے ہی ہوں' اپنی عزت یا رُتبہ خواہ قلیل ہی ہو' اپنے جلیس' ہم صحبت' دوست اور مُلک جس کی وہ زبان سمجھتے تھے' جہاں کے لوگ ان کی دیانت اور وہ ان کی دیانت سے واقف تھے' سب کچھ چھوڑ دیا' صرف اس لئے کہ انہیں زندگی ملے اور وہ موت سے بچیں-

وہ ایک ایسے ملک کی طرف چلے گئے جہاں کی زبان وہ نہیں جانتے تھے- ان کی وہاں کوئی جائداد نہیں تھی- وہاں کے لوگ اِن کی دیانت اور یہ اُن کی دیانت سے واقف نہ تھے- جہاں کے لوگوں کی نگاہ میں ان کے چھوٹے بڑے میں کوئی تمیز نہ تھی- ان تمام دِقتوں کو برداشت کرتے ہوئے جنگل بیابان میں' غیر معروف جگہ پر' ناواقف قوم میں چلے جانا معمولی قربانی نہ تھی- اور یہ قربانی صرف اس لئے کی گئی تھی کہ انہیں جان بہت پیاری تھی ورنہ وہ اس ملک کو چھوڑتے ہی کیوں؟ مگر وہ جب وہاں پہنچے تو خدا تعالیٰ سے انہوں نے سوال کیا کہ وہ زندگی

کہاں ہے؟ اللہ تعالیٰ نے فرمایا موت قبول کرو' پھر تم زندہ ہوجاؤ گے- وہ حیران ہوئے کیونکہ جو پیالہ فرعون اُنہیں پلارہا تھا' وہی اللہ تعالیٰ نے انہیں دیا- فرعون نے فیصلہ کیا تھا تم مرجاؤ- انہوں نے کہا ہم زندہ رہنا چاہتے ہیں- اس لئے ہم خداتعالیٰ سے فریاد کریں گے- لیکن جب انہوں نے خداتعالیٰ سے فریاد کی تو وہاں سے بھی یہی جواب ملا کہ مرجاؤ- انہیں دونوں جگہوں سے موت کا پیالہ ہی ملا- وہ حیران تھے کہ فرعون کو دوست سمجھیں یا خداتعالیٰ کو دشمن- فرعون اُنہیں زندہ کرنا چاہتا تھا یا خداتعالیٰ مارنا- کیونکہ دنوں پیالوں پر موت لکھی ہوئی تھی- وہ گھبرائے ان میں سے کمزوروں نے کہا ہم تو موت سے بچنے کیلئے آئے تھے- اگر یہی پیالہ ہمیں پینا ہوتا تو وہیں کیوں نہ پی لیتے- اتنی تکالیف برداشت کرنے کی کیا ضرورت تھی- ہم اس پیالہ کو پینے کیلئے تیار نہیں- ہم سے دھوکا کیا گیا ہے- اگر موت ہی ہمیں ملنی تھی تو کیوں ہم سے زندگی کا وعدہ کیا گیا تھا- اتنی امیدیں دلانے کے بعد ہمیں قوم میں کیوں شرمندہ کرایا- وہ ہنسیں گے کہ بیوقوف موت سے بھاگے تھے' وہاں بھی موت ہی نصیب ہوئی- وہ اس مشکل کو حل نہ کرسکے- سوائے اس کے کہ ان میں سے کمزوروں نے کہا کہ ہم یہ پیالہ پینے کیلئے تیار نہیں- عزت کی زندگی جس کا ہم سے وعدہ تھا' وہ ہمیں دو- یہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی قوم تھی- فرعون انہیں تباہ کرنا چاہتا تھا- موسیٰ علیہ السلام نے ان سے کہا تمہارے سب لڑکے مارے جائیں گے- لازماً لڑکیاں غیروں سے بیاہی جائیں گی- تمہاری نسل مٹ جائے گی اور غیروں کی نسل جاری رہے گی' تم اس موت سے بچو اور ذلت کی زندگی برداشت نہ کرو- خدا نے تمہیں بتایا ہے کہ حیات کا پیالہ تمہارے لئے کنعان کی زمین میں تیار ہے- انہوں نے گھربار چھوڑا مال جو نہ اٹھایا گیا وہیں چھوڑا- عزت سے ہاتھ دھوئے ایک باقاعدہ حکومت کا آرام کھویا- وہ نکلے اور چل پڑے- قرآن مجید میں خداتعالیٰ فرماتا ہے- وَهُمْ اُلُوْفٌ [۱]- یعنی وہ چند ہزار تھے- ان میں سے بہت سی عورتیں بچے بھی ہوں گے- عام طور پر قریباً پانچواں حصہ بالغ مرد ہوتے ہیں- پھر ان میں کچھ بوڑھے بھی ہوں گے- متمدن اقوام میں سے چھ فیصدی مرد جنگ کے قابل ہوتے ہیں اور غیر متمدن قوموں میں سے سولہ فیصدی- اگر وہ پچاس ہزار بھی ہوں تو ان میں سے زیادہ سے زیادہ آٹھ ہزار لڑائی کے قابل مرد ہوں گے- وہ بھی ناتجربہ کار پتھیرے بھلا کیا جانیں کہ جنگ کیا ہوتی ہے- انہوں نے کہا لاؤ جو تم نے وعدہ کیا تھا- ایک زبردست قوم کے لوگ جن کے چہرے خون سے بھرے ہوئے تھے جنہیں اگر دائیں طرف عرب کے جنگجوؤں

سے مقابلہ کرنا پڑتا۔ تو بائیں طرف یونانیوں سے۔ تہذیب کے گہوارہ میں پلی ہوئی تین قوموں یونانیوں' ایرانیوں اور مصریوں سے انہیں واسطہ پڑتا۔ وہ تینوں کے طریقِ کار سے واقف تھے۔ وہ خود بھی مہذب اور بڑے بڑے شہروں میں رہنے والے تھے۔ اور بنی اسرائیل سے قریباً دس گُنے زیادہ تھے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے جواب میں یہ قوم دکھا کر اپنی قوم سے کہا کہ اس قوم کو ماردو' پھر حکومت تمہارے ہاتھ میں آجائے گی۔

بنی اسرائیل پر حیرت کا اظہار کرنا آسان ہے لیکن ذرا سوچو! تمہارا ایک دوست تمہاری دعوت کرے۔ وقت مقررہ پر وہ آکر تمہیں بلالے جائے۔ جب وہ بازار میں پہنچے تو ایک بڑے ہوٹل میں چلا جائے۔ جہاں ہر ایک چیز پانچ چھ گُنا زیادہ قیمت پر ملتی ہے۔ اور کہے کہ یہ ہوٹل ہے اس پر آپ آٹھ دس روپیہ خرچ کرکے کھانا کھاسکتے ہیں۔ دوسری طرف ایک ایسا مکان بھی ہے جہاں سے کھانوں کی خوشبو آرہی ہے۔ آپ اندر گھس جائیں' ان کے سر لٹھ سے پھوڑ دیں اور کھانا لے لیں۔ اس جواب کو سن کر تمہاری حالت کیا ہوگی۔ تم اس کو ذلیل کرنے والا تمسخر خیال کروگے اور اس دوست سے ناراض ہوجاؤ گے۔ شاید تم میں سے جوشیلے ایسے دوست پر حملہ ہی کر بیٹھیں۔ یہی حالت یہاں ہے سینکڑوں میل سے حضرت موسیٰ علیہ السلام اپنی قوم کو اس وعدہ پر کہ وہاں انہیں بادشاہت ملے گی' لائے مگر وہاں پہنچ کر انہیں کہہ دیا کہ اس قوم کو ماردو اور ان سے حکومت چھین لو۔ اس جہالت کو دیکھ کر جو بنی اسرائیل میں اُس وقت پھیلی ہوئی تھی' خیال کیا جاسکتا ہے کہ انہوں نے اس جواب پر سر پیٹ لیا ہوگا۔ وہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی طرف دیکھتے ہوں گے کہ تم نے وعدے کیا کئے تھے اور اب کہہ کیا رہے ہو۔ وہ کہتے ہوں گے وہیں ہمیں کیوں نہ کہہ دیا کہ فرعون کا سر اُڑادو اور حکومت چھین لو۔ وہاں پر تو ہم کر بھی سکتے تھے کیونکہ ہمارے آدمی فرعون کے گھروں میں کام کرتے تھے۔ وزراء ہمارے واقف تھے اور کئی سہولتیں ہمیں میسر تھیں لیکن یہاں پر زبان اور ہے' اس لئے ہم جاسوسی بھی تو نہیں کرسکتے۔ وہ ذرائع ہمیں یہاں میسر نہیں۔ ان لوگوں کو مارنا بھلا کون سا آسان کام تھا کہ تم ہمیں وہاں سے نکال لائے اور یہاں آکر کہہ دیا کہ ان کو ماردو اور ملک پر قبضہ کرلو۔ یہ خدا کا وعدہ تھا لیکن خدا انہیں نظر نہیں آتا تھا' ورنہ اس سے ہی جھگڑا کرتے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام انہیں نظر آتے تھے۔ بظاہر حالات انہوں نے شرافت سے کام لیا۔ ورنہ وہ حضرت موسیٰ علیہ السلام پر حملہ آور ہوتے کہ تم نے ہمارے ساتھ دھوکا کیا۔ بائیبل

میں ذکر ہے کہ وہ روئے پیٹے اور بچوں کی طرح روٹھ گئے۔ قرآن کریم فرماتا ہے۔ انہوں نے کہا۔ اے موسیٰ! فَاذْهَبْ اَنْتَ وَ رَبُّكَ فَقَاتِلاَ اِنَّا هٰهُنَا قَاعِدُوْنَ ؎ - ہمارے مدمقابل ایک تجربہ کار جنگجو قوم ہے۔ ان کے پاس اسلحہ بھی ہم سے زیادہ ہیں۔ وہ اپنے وطن میں ہیں اور راستوں سے اچھی طرح واقف ہیں۔ ہمیں تو یہ بھی نہیں معلوم کہ ان کا تعاقب کیسے کریں۔ وہ محفوظ قلعوں میں ہیں اور ہم جنگلوں میں۔ تم نے ہم سے وعدہ کیا تھا کہ ہمیں بادشاہت دو گے۔ اس لئے ہم تو ہاتھ نہیں اُٹھائیں گے اور یہیں بیٹھے رہیں گے تم اور تمہارا خدا جاؤ اور ملک فتح کرکے ہمیں دے دو۔

بظاہر معلوم ہوتا ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے ان سے غداری کی۔ انہوں نے ان سے ایک وعدہ کیا تھا جسے لفظاً پورا نہیں کیا۔ وہ بھی مولوی ثناء اللہ صاحب کی قسم کے لوگوں کی طرح ان سے اس وعدہ کے لفظی ایفاء کا مطالبہ کرتے ہیں۔ ایک ظاہر بین کی نگاہ میں یہ مطالبہ بالکل معقول معلوم ہوتا ہے لیکن جب ہم اس واقعہ کو ایک اور نقطہ نگاہ سے دیکھتے ہیں تو اس کی شکل ہی بدل جاتی ہے۔ رسول کریم ﷺ نے مکہ کی فتح پر انصار سے مخاطب ہوکر فرمایا۔ اے انصار! کیا تم نے یہ کہا ہے کہ خون تو ہماری تلواروں سے ٹپک رہا ہے اور مالِ غنیمت مہاجرین میں تقسیم کیا جارہا ہے۔ انہوں نے عرض کیا۔ حضور ہم میں سے ایک نوجوان نے نادانی سے ایسا کہہ دیا۔ آپ نے فرمایا تم کہہ سکتے ہو کہ محمد (ﷺ) کو ہم نے بے در پایا' ہم نے اسے اپنے گھروں میں جگہ دی۔ اس کے بھائی اس کے خون کے پیاسے تھے' ہم اس کے آگے پیچھے لڑے۔ دنیا میں اس کی بات کوئی نہ سنتا تھا' ہم نے لوگوں تک اس کا پیغام پہنچایا۔ پھر جب فتح ہوئی تو اس نے مال اپنی قوم میں تقسیم کردیا۔ لیکن تم یہ بھی کہہ سکتے ہو کہ محمد (ﷺ) نے ہمیں قُربِ الٰہی حاصل کرایا' تقویٰ دیا' خدا کی محبت دی۔ اللہ تعالیٰ نے اپنے فضل و نصرت سے اسے فتح دی اور خدائی فوجوں نے مکہ فتح کیا۔ مکہ اس کا پیدائشی مقام تھا اور مہاجرین کا وطن - انہیں توقع تھی کہ مکہ فتح کرکے وہ اپنے گھروں پر قبضہ کریں گے مگر مکہ والے چند اونٹ لے گئے اور ہم اپنے ساتھ رسول اللہ کو لے آئے ؎ - یہی دونوں رُخ یہاں ہیں۔ اگر حکومت کے رنگ میں کوئی تغیر خداتعالیٰ کو منظور نہیں تھا تو اسے بھلا اس سے کیا تھا کہ حضرت موسیٰ بادشاہ ہوں یا فرعون۔ مصر بنو لاوی کا ہو یا بنی اسرائیل کا۔ اگر وہ ایسی ہی حکومت پسند کرتا جیسی فرعون کی تھی تو فرعون سے حکومت

چھین کر بنی اسرائیل کو کیوں دینا چاہتا- خدا تعالیٰ تو ایسی قوم کو بادشاہت دینا چاہتا تھا جو اخلاق کی خوشنما حکومت قائم کرتی- خدا تعالیٰ بنی اسرائیل کو ایک ایسی زندگی نہیں دینا چاہتا تھا جو ختم ہو جاتی- ایسی زندگی تو چمار بھی دیتا ہے جب وہ بچہ پیدا کرتا ہے- لیکن خدا انہیں ایسی زندگی دینا چاہتا تھا جو کوئی اور نہیں دے سکتا تھا- خدا تعالیٰ انہیں اخلاقِ فاضلہ کی ہمیشہ کی زندگی دینا چاہتا تھا جو فرعون انہیں نہیں دے سکتا تھا- اور ایسی زندگی بغیر تربیت اور قربانی کی عادت کے انہیں نہیں مل سکتی تھی- خدا تعالیٰ انہیں ایک تازہ نشان کے ساتھ زندہ کرنا چاہتا تھا- ان میں سے ہر ایک دس دس کے مقابل کھڑا ہوتا' پھر خدا ان کو فتح دیتا تو وہ ایک زندہ نشان دیکھتے جس سے ان کی اصلاح ہوتی اور اس طرح ان کو حقیقی زندگی ملتی- گویا پیالے دونوں موت کے تھے لیکن فرعون کے پیالہ میں شربت بھی موت کا تھا اور خدا تعالیٰ کے پیالہ میں زندگی کا- یہ فرق تھا جسے وہ سمجھ نہ سکے- اگر وہ فرعون کا پیالہ پی لیتے تو ہمیشہ کیلئے انہیں موت ملتی- لیکن اگر وہ خدا تعالیٰ کا پیالہ پی لیتے تو وقتی موت ہوتی جس کے بعد انہیں ہمیشہ کیلئے زندگی ملتی- مگر انہوں نے اس فرق کو نہ سمجھا اور خدا تعالیٰ کا پیش کردہ موت کا پیالہ پینے سے بھی اسی طرح انکار کردیا جس طرح فرعون کا پیالہ پینے سے انکار کیا تھا- تب اللہ تعالیٰ نے پھر انہیں فرمایا کہ- فَقَالَ لَهُمُ اللّٰهُ مُوْتُوْا ۔ تم اپنے ہاتھ سے موت لینے سے انکار کرتے ہو' ہم خود تمہیں موت دیتے ہیں- تم اس موت کا مقابلہ نہیں کرسکو گے- لیکن اللہ تعالیٰ نے فرعون کی دی ہوئی موت اور اپنی دی ہوئی موت میں فرق رکھا- وہ لوگ گھر سے تو اللہ تعالیٰ کے وعدہ پر اعتبار کرکے ہی نکلے تھے- اللہ تعالیٰ نے کچھ عرصہ کی موت کے بعد انہیں پھر زندگی دے دی- اور اس طرح اس وعدہ کو پورا کردیا-

یہ ایک چھوٹی سی آیت ہے لیکن اس میں اللہ تعالیٰ نے قومی جدوجہد کا نقشہ بیان کردیا ہے- سورۃ بقرۃ میں اللہ تعالیٰ رسول کریم ﷺ کے چار کام بتاتا ہے- يَتْلُوْا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِكَ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ وَيُزَكِّيْهِمْ ۔ اول آیات الٰہی سنانے کا کام' دوسرا تعلیم کتاب کا' تیسرا حکمت کا' چوتھا تزکیہ نفس کا- یہ آیت جس کا میں نے ذکر کیا ہے يُعَلِّمُهُمُ الْحِكْمَةَ کے ماتحت ہے- یہاں قوموں کی ترقی کے ذرائع بیان کئے گئے ہیں- اللہ تعالیٰ نے اس جگہ مثال دے کر بتایا ہے کہ اس طرح قومیں ترقی کرسکتی ہیں- جب کبھی بھی کسی قوم کو موت کا ڈر ہو' اس کا یہی علاج ہے کہ یا تو وہ اپنے ہاتھ سے موت قبول کرلے یا خدا کے ہاتھ

ہے- اپنے ہاتھ سے موت قبول کرنے میں کئی آسانیاں ہیں- حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام فرمایا کرتے تھے کہ جب تم اپنے ہاتھ سے ابتلاء لو تو تم اسے کم کرسکتے ہو- جیسے سردی میں وضو کیلئے پانی کی ٹھنڈک تم دور کرسکتے ہو- ایسے ہی جنگ میں تم بخوشی موت قبول کرتے ہو لیکن تم اس سے بچاؤ کیلئے تلوار ہاتھ میں پکڑلیتے ہو اور بدن پر زِرہ پہن لیتے ہو تاکہ جہاں تک ہوسکے موت کے اثر کو کم کردو- اگر تم زخمی ہو تو علاج کراسکتے ہو لیکن خداتعالیٰ کی دی ہوئی موت سے تم کوئی بچاؤ نہیں کرسکتے- خداتعالیٰ کا قانون کام کرتا چلا جاتا ہے- اور وہ یہ نہیں دیکھتا کہ اس طرح تکلیف کم ہوگی یا زیادہ- مثلاً ہیضہ یا طاعون کی وبائیں بِلالحاظ مارتیں چلی جاتی ہیں- الغرض تم خود ایک چیز کی تکلیف کم کرسکتے ہو- اسی لئے جب کانٹا چُبھ جائے تو تم اسے اپنے ہاتھ سے نکالنے کی کوشش کرتے ہو- کیونکہ دوسرے سے تمہیں یہ توقع نہیں ہوسکتی کہ وہ اس تکلیف کو کم کرنے کی ایسی ہی کوشش کرے گا جیسی تم خود کرسکتے ہو- پس جب قوم کی موت آتی ہے تو اس کا علاج زندہ رہنا نہیں بلکہ یہ ہے کہ وہ موت کو قبول کرے- دنیا میں تین قسم کی قومیں ہوتی ہیں- ایک تو وہ جو موت کو خود قبول کرلیتی ہیں- بعد میں انہیں ہمیشہ کیلئے زندگی مل جاتی ہے- جیسے رسول کریم ﷺ کے ساتھی قُلْ لَّوْ كُنْتُمْ فِيْ بُيُوْتِكُمْ لَبَرَزَ الَّذِيْنَ كُتِبَ عَلَيْهِمُ الْقَتْلُ اِلٰى مَضَاجِعِهِمْ ؁۵ - میں بعض لوگ سمجھتے ہیں کہ یہاں ان کا ذکر ہے جن کیلئے مقتول ہونا مقدر ہوتا ہے- حالانکہ یہاں یہ مطلب نہیں یہاں قتل کا لفظ موت کے معنی میں ہے- چونکہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے زمانہ کی موت کی طرف اشارہ کرنا منظور تھا- اس لئے قتال نہیں کہا بلکہ قتل کہا ہے گویا یہ قتال بھی قتل ہی ہے- صحابہ کے سامنے موت پیش ہوئی- انہوں نے اسے قبول کرلیا نتیجہ میں انہیں ہمیشہ کی زندگی مل گئی- جنگ بدر کے موقع پر تمام صحابہ حضور کے ساتھ نہیں گئے تھے کیونکہ رسول کریم ﷺ نے کسی مصلحت کی وجہ سے انہیں جنگ کی خبر نہیں دی تھی گو آپ کو اس کا علم تھا- آپ نے صحابہؓ سے دریافت فرمایا- مجھے مشورہ دو کہ لڑنا چاہیئے یا نہیں- مہاجرین نے عرض کیا ضرور یارسول اللہ!- آپ نے دوبارہ فرمایا مشورہ دو- ہمیں لڑنا چاہیئے یا نہیں؟ مہاجرین نے پھر عرض کیا- ضرور یا رسول اللہ!- پھر آپ نے فرمایا- تم مشورہ کیوں نہیں دیتے- اِس پر ایک انصاری کھڑے ہوئے اور عرض کیا- یا رسول اللہ! آپ کی مراد ہم سے ہے- انصار سے معاہدہ تھا کہ مدینہ کے اندر وہ آنحضرت ﷺ کے ساتھ مل کر دشمن کا مقابلہ

کریں گے' مدینہ سے باہر وہ حفاظت کے ذمہ دار نہیں ہوں گے۔ اس وجہ سے رسول کریم ﷺ انہیں سے مشورہ لینا چاہتے تھے۔ اس انصاری نے آپ کے مطلب کو سمجھ لیا اور عرض کیا یا رسول اللہ بے شک ہمارا یہ معاہدہ تھا کہ مدینہ سے باہر ہم نہیں لڑیں گے۔ لیکن وہ تو ابتدائی زمانہ تھا' اب خدا کا نور ہم نے خود اُترتے دیکھ لیا ہے۔ اب یہ نہیں ہوسکتا کہ آپ میدان جنگ میں جائیں اور ہم نہ جائیں۔ ہم ان انصار کی طرف سے بھی جو علم نہ ہونے کی وجہ سے مدینہ میں رہ گئے ہیں' حضور کو یقین دلاتے ہیں کہ اگر وہ بھی یہاں موجود ہوتے تو ضرور آپ کے ساتھ جنگ میں شامل ہوتے۔ یا رسول اللہ! آپ ہم کو حکم دیجئے کہ سمندر میں گھوڑے ڈال دو۔ پھر دیکھئے ہم ڈالتے ہیں یا نہیں۔ یا رسول اللہ! ہم آپ کے دائیں بھی لڑیں گے اور بائیں بھی اور آگے بھی اور پیچھے بھی اور کوئی شخص آپ تک نہیں پہنچ سکتا جب تک ہماری لاشوں پر سے نہ گزرے[۷]۔ یہ فقرہ صحابہ کو اس قدر پسند تھا کہ ایک صحابی نے جو ۱۴ یا ۱۸ جنگوں میں شریک ہوئے تھے کہا کرتے تھے کہ باوجود اس کے کہ مجھے اتنی جنگوں میں شمولیت کا فخر حاصل ہے' میرے نزدیک صحابی کا وہ فقرہ میری ساری لڑائیوں سے بہتر تھا' کاش کہ وہ میرے منہ سے نکلتا[۸]۔

غرض ایک تو یہ قوم تھی جنہوں نے بخوشی موت کو قبول کیا اور اس کے مطابق اس سے سلوک ہوا۔ دوسری قوم حضرت موسیٰ علیہ السلام کی تھی۔ اللہ تعالیٰ نے ان سے زندگی کا وعدہ کیا تھا۔ اس نے وعدہ کے لفظاً ایفاء کا مطالبہ کیا کہ تم بادشاہت دو ہم لے لیں گے۔ وہ مولوی ثناء اللہ صاحب والی سیرت کے لوگ تھے۔ جیسے مولوی صاحب الفاظِ الہام کو دیکھتے ہیں۔ وہ بھی الفاظِ الہام کو دیکھتے تھے۔ انہوں نے کہا۔ تم ہم کو زندگی دینے کے وعدے پر لائے تھے۔ تم نے ہمیں بادشاہت دینے کا وعدہ کیا تھا' تم ملک لے کر ہمیں دو' ہم لڑ کر ملک لینے کو تیار نہیں۔ اگر تم ایسا نہیں کرسکتے تو سمجھ لو کہ تم جھوٹے ہو اور تمہارا الہام جھوٹا ہے۔ خدا نے اُنہیں موت دے دی۔ مگر چونکہ زندگی کا وعدہ بھی کیا ہوا تھا اس لئے زندگی بھی دے دے۔ لیکن چالیس سال کے بعد جبکہ وہ نسل جس نے خود موت لینے سے انکار کردیا تھا' بیابانوں میں تباہ ہوچکی تھی۔ خداتعالیٰ نے اِنَّا هٰهُنَا قَاعِدُوْنَ کہنے والوں کے بچوں کو جنہوں نے یہ فقرہ نہیں کہا تھا اُٹھایا اور زندگی کا وعدہ ان کے زمانہ میں پورا کردیا (ثُمَّ اَحْيَاهُمْ)[۹]۔ تیسری قسم کی قوم وہ ہے جس سے کوئی وعدہ نہیں ہوتا۔ یہ قوم جب موت کے منہ میں آتی ہے تو اس

سے سلوک اس کی اپنی ہمت کے مطابق ہوتا ہے۔ کبھی اپنی کوشش سے یہ بچ جاتی ہے، کبھی ہلاک ہوجاتی ہے۔ ہماری جماعت سے بھی خداتعالیٰ نے زندگی کا وعدہ کیا ہے۔ اس لئے ہمیں بھی پہلے موت کا پیالہ پینا ہوگا۔ کیونکہ آدمؑ سے لے کر اب تک خداتعالیٰ کی یہی سنت رہی ہے کہ زندگی حاصل کرنے سے پہلے موت کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ وہ لوگ جاہل ہیں جو یہ سمجھتے ہیں کہ ہم سے زندگی کا پیالہ دینے کا وعدہ ہے، ہمیں زندگی کا پیالہ ہی ملنا چاہیئے ورنہ خداتعالیٰ کا وعدہ جھوٹا ہے۔ اب خواہ تم حضرت موسیٰ علیہ السلام کی قوم کا وطیرہ اختیار کرو یا محمد ﷺ کی قوم کا۔ بہرحال تمہیں موت کا پیالہ پینا ہوگا۔ اگر تم اپنے ہاتھ سے وہ پیالہ پی لو تو تم ہمیشہ کیلئے زندہ رہو گے۔ لیکن اگر خدا کے ہاتھ سے پیو تو کم سے کم چالیس سال تک کی موت تمہیں نصیب ہوگی۔ نادان ہیں ہم میں سے وہ جو یہ کہتے ہیں کہ ہمیں زندگی کے پیالہ کا وعدہ ہے۔ آسمانی اصطلاح میں زندگی کے پیالہ سے مراد موت کاپیالہ لے کر زندگی کا نصیب ہونا ہوتا ہے۔ اب یہ بات تمہارے اختیار میں ہے کہ تم حضرت موسیٰ علیہ السلام کی قوم کی طرح موت کا پیالہ پینے سے انکار کردو یا محمد ﷺ کے صحابہ کی طرح موت کا پیالہ قبول کرلو اور ہمیشہ کی زندگی لے لو۔ یہ بھی یاد رکھو کہ یہ کافی نہیں کہ تم میں سے ہر ایک اپنے متعلق فیصلہ کرلے کہ وہ کس قوم کی طرح ہوگا۔ خدا کا فیصلہ کثرت پر ہوگا۔ تم میں سے اکثر جس قوم کی طرح ہوں گے ویسا ہی تم سے سلوک کیا جائے گا۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی قوم میں بھی اور نہیں تو کم از کم حضرت موسیٰؑ اور حضرت ہارون علیہ السلام ایسے تھے جو محمد ﷺ کی قوم کی طرح تھے۔ مگر ان سے بھی ویسا ہی سلوک کیا گیا جیسا دوسروں کے ساتھ۔ ان کو بھی حکومت نہ دی گئی اور وہ بھی وہیں فوت ہوگئے۔ ان کے بعد حضرت یوشع کو حکومت ملی جو حضرت موسیٰ علیہ السلام کے دعویٰ کے وقت ابھی پیدا بھی نہیں ہوئے تھے یا ابھی کمسن تھے۔ اور ان میں سے نہیں تھے جنہوں نے موت کا پیالہ قبول کرنے سے انکار کردیا تھا۔ پس ہمیں دیکھنا چاہیئے کہ جماعت میں سے کثرت کس طرف ہے؟ اگر تم میں رسول کریم ﷺ کے ساتھیوں کی طرح کے لوگ زیادہ ہیں، تو تم میں سے کمزور بھی بچ جائیں گے۔ جیسے رسول کریم ﷺ کے ساتھ کمزور بھی فتح یاب ہوئے تھے۔ اور اگر حضرت موسیٰ علیہ السلام کی قوم کی طرح کے لوگوں کی کثرت ہے تو پھر ان کو بھی جو محمد ﷺ کی قوم کی طرح ہیں، موت قبول کرنا ہوگی۔

بعض لوگ کہہ دیتے ہیں کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی قوم نے قربانی سے انکار کردیا

تھا حالانکہ ہم چندہ دیتے ہیں- وہ یہ نہیں سوچتے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی قوم نے تو آخری موت سے انکار کیا تھا ورنہ انہوں نے اپنے مکان چھوڑ دیئے- اپنے بھاری اسباب چھوڑ دیئے- اپنا وطن چھوڑ دیا- اپنے دوست چھوڑ دیئے اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کی آواز پر لبیک کہا گویا جائداد کا نصف حصہ سے زیادہ قربان کردیا- کیونکہ غیر منقولہ جائداد منقولہ کی نسبت زیادہ ہوتی ہے- پس یہ خیال کرنا غلطی ہے کہ ان لوگوں نے قربانی نہیں کی وہ تو ہمارے بہت سے چندہ دینے والوں سے بڑھ کر تھے- انہوں نے تو صرف آخری پیالہ جو صاف موت کا پیالہ تھا پینے سے انکار کیا' ورنہ چندہ تو انہوں نے خوب دیا- کیونکہ اپنا وطن' اپنے مکان' اپنی زمینیں اور اپنے بھاری اسباب سب خدا کیلئے چھوڑ دیئے- پس جب خداتعالیٰ کہتا ہے کہ انہوں نے موت قبول نہیں کی تو صاف معلوم ہوتا ہے کہ خداتعالیٰ کے نزدیک موت قبول کرنا ان قربانیوں سے بڑھ کر کوئی چیز ہے- پس ہمیں بھی وہم دور کرکے موت کیلئے تیار ہوجانا چاہیئے ورنہ زبانی دعوے پاگلوں کی بڑ سے زیادہ وقعت نہیں رکھتے-

(الفضل ۳- ستمبر ۱۹۳۳ء)

۱؎ البقرۃ:۲۴۴ ۲؎ المائدۃ:۲۵

۳؎ بخاری کتاب مناقب الانصار باب مناقب الانصار

۴؎ البقرۃ:۲۴۴ ۵؎ البقرۃ:۱۳۰ ۶؎ اٰل عمران:۱۵۵

۷؎ بخاری کتاب المغازی باب قول اللّٰہ تعالیٰ اذ تستغیثون ربکم الخ

۸؎ عمدۃ القاری فی شرح البخاری جلد ۱۷ صفحہ ۸۰'۸۱ مطبوعہ مکتبۃ الرّشیدیۃ الطبعۃ الاولیٰ کوئٹہ پاکستان

۹؎ البقرۃ:۲۴۴